# تعمیرِ اخلاق کیوں اور کیسے؟

ابوالاعلیٰ مودودی

(ایک انٹرویو جو "اردو ڈائجسٹ" لاہور کو دیا گیا)

اخلاق حقیقت میں انسانیت کا اصل جوہر اور انسان و حیوان کے درمیان وجہِ امتیاز ہے۔ دُنیا اور آخرت میں انسان کی کامیابی کا دار و مدار اخلاق ہی پر ہے۔ کوئی انسان اپنی انفرادی حیثیت میں، اور کوئی انسانی گروہ اپنی اجتماعی حیثیت میں اخلاق کے بغیر کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کو اپنے استحکام کے لیے کچھ بنیادی اخلاقیات کی ضرورت نہ ہو۔ کیا آپ کو امن میسّر آسکتا ہے اگر آپ کے شہروں اور بستیوں میں انسانی زندگی کا احترام اور دوسروں کے حقوق کا پاس و لحاظ موجود نہ ہو؟ کیا آپ کا معاشرہ تباہی سے بچ سکتا ہے اگر اس میں ہر شخص قدرت پا کر اپنے حدود سے تجاوز کرنے اور دوسروں کی جان و مال اور آبرو پر دست درازی کر گزرنے کا خوگر ہو؟ کیا آپ کسی تہذیب کا تصوّر کر سکتے ہیں اگر افراد اور گروہوں کے برتاؤ کو ضابطہ میں رکھنے کے لیے کوئی معقول قانون موجود نہ ہو، یا موجود تو ہو مگر اس کی پابندی نہ کی جاتی ہو؟ کیا آپ کوئی مضبوط تمدنی نظام چلا سکتے ہیں اگر آپ کی معاشرت اور سیاست اور معیشت میں دیانت و امانت، عدل و انصاف، فرض شناسی اور راست بازی موجود نہ ہو؟ بلکہ میں پوچھتا ہوں، کیا آپ ایک آزاد قوم کی حیثیت سے اپنے وجود کو بھی بچا سکتے ہیں اگر آپ کے افراد میں وہ خود غرضی پرورش پا رہی ہو جو ان کے دلوں میں اپنی ذات اور ذاتی مفاد سے بالاتر کسی چیز کی وفاداری کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ چھوڑے؟

ایک مسلمان کی حیثیت سے آپ دیکھیں تو اخلاق کی پستی کے ساتھ ہم سرے سے کسی اسلامی زندگی کا تصور ہی نہیں کرسکتے۔ مسلمان تو مسلمان بنایا ہی اس لیے گیا ہے کہ اس کی ذات سے دنیا میں بھلائی قائم ہو اور برائی مٹے۔ بھلائی کو مٹانا اور برائی پھیلانا، اور پھر اس کے ساتھ مسلمان بھی ہونا، یہ درحقیقت ایک کھلا ہوا تناقض ہے۔ ایک شخص مسلمان ہو اور پھر بھی اُس کے شر سے دوسرے بندگانِ خدا محفوظ نہ ہوں، ایک شخص مسلمان ہو اور پھر بھی اُس پر کسی معاملہ میں اعتماد نہ کیا جاسکے، ایک شخص مسلمان ہو اور پھر بھی وہ نیکی سے بھاگے اور بدی کی طرف لپکے، حرام کھائے اور حرام طریقوں سے اپنی خواہشات پُوری کرے، تو آخر اس کے مسلمان ہونے کا فائدہ کیا ہے۔ کسی مسلم معاشرے کی اس سے بڑھ کر کوئی ذلت نہیں ہوسکتی کہ وہ انصاف سے خالی اور ظلم سے لبریز ہوتا چلا جائے، اس میں روز بروز بھلائیاں دبتی اور بُرائیاں فروغ پاتی چلی جائیں، اور اس کے اندر دیانت و امانت اور شرافت کے لیے پھلنے پھولنے کے مواقع کم سے کم تر ہوتے چلے جائیں۔ یہ خدا کے غضب کو دعوت دینے والی حالت ہے۔ اگر کسی مسلم معاشرے کی یہ حالت ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اسلام کی رُوح سے خالی ہو چکا ہے۔ صرف اسلام کا نام ہی اس میں باقی رہ گیا ہے، اور یہ نام بھی اب صرف اس لیے رہ گیا ہے کہ دنیا کو اس دینِ حق سے دُور بھگاتا رہے۔

مسلمان اخلاقی زوال کی طرف جاتا ہی اس وقت ہے جب اسے خدا کی رضا اور آخرت کی فلاح مطلوب نہیں رہتی اور صرف دنیا اس کی مطلوب بن کر رہ جاتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اخلاق کی پستی کے ساتھ کوئی قوم دنیا کی کامیابی بھی حاصل نہیں کرسکتی۔ اس پستی کے ساتھ تو آخرت بھی ہاتھ سے جاتی ہے اور دنیا بھی ہاتھ نہیں آتی۔

سب سے بڑھ کر دولت کی پیاس ہم کو دنیا طلبی کی طرف لے جا رہی ہے۔ مگر اس کے لیے ہم نے افراد اور طبقوں کی خود غرضی اور بددیانتی کو وسیلہ بنایا ہے، حالانکہ اس سے بڑھ کر کوئی چیز ہماری معاشی ترقی کی راہ میں حائل نہیں ہے۔ مجھے مشرقِ اوسط کے متعدد ملکوں میں جانے

کا اتفاق ہوا ہے۔ وہاں میں نے جب تاجروں سے کہا کہ آپ جو مال باہر کے بعض غیر مسلم ممالک سے منگاتے ہیں وہ آپ کے ایک بھائی مسلمان ملک، پاکستان سے بھی مل سکتا ہے، اسے چھوڑ کر آپ دوسروں سے کیوں خریدتے ہیں؟ تو ان کا یہ جواب سُن کر میں شرم سے پانی پانی ہو گیا کہ ہم نے مجبوراً پاکستان سے مال منگانا بند کیا ہے۔ وہاں سے نمونہ اچھا دکھا کر فرمائش حاصل کی جاتی ہے اور پھر اس کی تعمیل میں ردّی مال بھیج دیا جاتا ہے۔ فرمائیے، کیا اس بد دیانتی کے ساتھ ہم تجارت میں کوئی ترقی کر سکتے ہیں؟ ہمارے کارخانہ دار اور بڑے تاجر جس خود غرضی کے ساتھ بے تحاشا منافع خوری کر رہے ہیں اس سے ایک محدود طبقہ تو بلاشبہ فربہ ہوتا جا رہا ہے، مگر قوم بحیثیت مجموعی لاغر ہو رہی ہے۔ یہ چیز آخر کب تک ہمیں اُس طبقاتی کشمکش کی آگ میں جُھلسنے سے بچا سکے گی جس میں اسی طرح کی حماقتیں کرنے والے بہت سے دوسرے ملک جُھلس چکے ہیں۔ پھر اسی خود غرضی کی بدولت ہمارے کارکن طبقوں میں کام چوری اور اپنے فرض سے غفلت اور صرف اپنے حقوق کے لیے لڑنے کی جو بیماری پھیل رہی ہے کیا واقعی یہ وہی راستہ ہے جس سے ہم معاشی ترقی کی طرف پیش قدمی کر سکیں گے؟

ہم ایک مدت سے مادی ترقی کے لیے تعلیم تعلیم کا شور مچا رہے ہیں۔ مگر ہماری تمام کوششیں صرف کتاب خواں بنانے میں صرف ہوتی رہی ہیں۔ انسان بنانے اور مسلمان بنانے کی ہم نے کوئی فکر نہیں کی ہے۔ بلکہ اس کے برعکس ہماری تعلیم گاہیں دھڑا دھڑ ایسے افراد تیار کر کر کے نکال رہی ہیں جو انسانی اخلاق سے بھی عاری ہیں اور اسلامی اخلاق سے بھی۔ ہمارے نصابِ تعلیم، اور طرزِ تعلیم اور تعلیمی ماحول میں سرے سے اس فکر کا کوئی نشان نہیں ملتا کہ ہمیں اپنے افراد میں کوئی قومی سیرت بھی پیدا کرنی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ حکومت سمیت ہمارے تمام شعبہ ہائے حیات کو جو کارکن مل رہے ہیں ان کے اندر کوئی قابلِ اعتماد کیرکٹر نہیں پایا جاتا، قلیل مستثنیات کو چھوڑ کر، جو روز بروز قلیل سے قلیل تر ہوتے جا رہے ہیں، ہمارے ہر شعبۂ زندگی کو ادنیٰ مراتب سے لے کر بلند ترین مناصب تک وہ لوگ چلا رہے ہیں جن کے اندر دیانت، امانت اور فرض شناسی کا فقدان ہے۔ جنہیں ذرا سا لالچ، یا تھوڑا سا خوف بھی راستی سے بآسانی ہٹا سکتا ہے۔ جو اپنے معمولی سے

فائدے کے لیے دوسروں کو، حتیٰ کہ اپنی قوم اور اپنے ملک تک کو بڑے سے بڑا نقصان پہنچا دینے میں تامل نہیں کرتے۔ جن کی نگاہ میں ضمیر و ایمان کی کوئی قیمت نہیں۔ جنہیں اپنی ذاتی اغراض کے لیے کسی اصول اور ضابطے کو توڑ دینے میں کوئی باک نہیں۔ رُوحانی ترقی کا سوال تو بہت اونچا ہے، کیا یہ تعلیم کسی مادی ترقی میں بھی ہمارے لیے واقعی مددگار ہو سکتی ہے؟ جس کیریکٹر میں امانتوں کا بوجھ سہارنے اور خوف و طمع کے مقابلے میں ٹھہر جانے کی طاقت نہ ہو وہ حیاتِ دنیا کے کسی میدان میں بھی آخر ہمیں کتنی دُور لے جا سکتا ہے۔

ہماری اصل طاقت وہ مادی ذرائع نہیں ہیں جو خالق نے ہمیں عطا کیے ہیں بلکہ وہ انسان ہیں جنہیں اِن ذرائع سے کام لینا ہے۔ یہ انسان اگر بگڑ جائیں تو مادی ذرائع ہمارے کس کام آسکتے ہیں۔ ان کے بگاڑ اور اس بگاڑ کے اثرات کو ہم محض حکومت اور قانون کی طاقت سے نہیں روک سکتے، کیونکہ اس طاقت کے کارگر ہونے کا انحصار بھی اُن انسانوں کی سیرت و کردار ہی پر ہے جو اس طاقت کو استعمال کریں۔ دنیا میں کوئی بہتر سے بہتر قانون بھی کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا اگر اس کے نافذ کرنے والے خود اس کو توڑیں اور اسے اپنی بدکرداریوں کے لیے ہتھیار بنانے پر تُل جائیں۔ ہر پابندی جو آپ کسی خرابی کو روکنے کے لیے لگائیں گے، ایک بددیانت نظم و نسق کے لیے وہ ناجائز فائدے اٹھانے کا ایک نیا دروازہ کھول دے گی اور اصلاح کے بجائے مزید خرابی کی موجب بن جائے گی۔ آپ کا قانون اپنی جگہ خواہ کتنا ہی معقول اور منصفانہ ہو، وہ معاشرے میں عدل قائم کرنے کا معجزہ نہیں دکھا سکتا اگر انصاف کی کرسی پر بیٹھنے والے ہی انصاف کا خون کرنے لگیں، اور قانون کی گرفت میں لانے والی مشینری ہی ظلم پر کمربستہ ہو جائے۔ دوسری طرف دیکھیے تو آپ کو نظر آئے گا کہ موجودہ زمانے کی کُلّیت پسندی نے ہر ملک کے قدرتی ذرائع و وسائل کو بہت بڑی حد تک حکومت کے کنٹرول میں دے دیا ہے۔ کوئی قوم بھی براہِ راست ان سے انتفاع نہیں کرتی بلکہ حکومت اس انتفاع کو منضبط کرتی ہے اور حکومت کے اس فریضے کو اس کے کارکن ہی انجام دیتے ہیں۔ ان کارکنوں کے ایماندار، فرض شناس اور بااصول ہونے کی

صورت میں خدا کے دیئے ہوئے ذرائع و وسائل سے جتنا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، اس کا عشر عشیر بھی ایسی حالت میں نہیں اٹھایا جا سکتا جبکہ ان کارکنوں کو رشوت، خیانت، کام چوری، سفارش، خویش پروری، اور خود غرضی کی بیماریاں لگی ہوئی ہوں، اور آئین وضابطہ کا کوئی احترام ان کے اندر موجود نہ ہو۔ خود حکومت کو بھی جو آمدنی ٹیکسوں اور دوسرے ذرائع سے ہو سکتی ہے، بددیانت کارکنوں کی وجہ سے نہ وہ کبھی پوری طرح وصول ہوتی ہے اور نہ اس کا صحیح استعمال ہی پوری طرح ہوتا ہے۔

یہ تو اُس حالت کی بات ہے جبکہ آئین وقانون بجائے خود درست ہو، اور کارفرما بھی صحیح قسم کے لوگ ہوں، صرف کارکن بگڑے ہوئے ہوں۔ لیکن جہاں آئین وقانون تک میں بکثرت بے انصافیاں اور صریح غیر معقول باتیں موجود ہوں، اور کارفرما اخلاقی بگاڑ میں کارکنوں کے ساتھ نہ صرف برابر کے شریک ہوں، بلکہ ان سے خود کام لیتے ہوں، وہاں بگاڑ اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے، اور حکومت ذریعۂ اصلاح کے بجائے الٹی موجبِ فساد بن جاتی ہے۔

ہم نے کارفرماؤں اور قانون سازوں کے انتخاب کے لیے جمہوریت کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ لیکن یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ "جمہوریت" کے نام میں کوئی معجزہ نہیں ہے جو آپ سے آپ اس انتخاب کو صحیح بنا دے۔ جمہوریت خود بھی اپنی کامیابی کے لیے چند اخلاقی اوصاف کی محتاج ہے جو اگر موجود نہ ہوں تو وہ سرے سے چل ہی نہیں سکتی۔ اس کے لیے کم سے کم جو اوصاف مطلوب ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ جس قوم میں جمہوریت رائج کی جا رہی ہو اس کے اندر خود اپنے حقوق کا صحیح شعور اور ان کی حفاظت کا مضبوط ارادہ موجود ہو۔ وہ مجموعی حیثیت سے اتنی جرأت وہمت رکھتی ہو کہ کسی استبداد کو اپنے اُوپر مسلط نہ ہونے دے۔ اور اس کے افراد کی اکثریت کسی لالچ کی بنا پر اپنی رائے بیچنے، یا خوف کی بنا پر اپنے ضمیر کے خلاف رائے دینے، یا کسی خود غرضی یا بے جا عصبیت کی بنا پر نااہل لوگوں کے حق میں رائے دینے کے لیے تیار نہ ہو۔

۲- اس کے نظم ونسق کو چلانے والے کارکنوں اور اس کے دفاع کی خدمت انجام دینے والے سپاہیوں میں اتنی حب الوطنی، اتنی آئین پسندی، اور خود جمہوریت کے تصور کے ساتھ اتنی وفاداری موجود ہو کہ وہ نہ تو جمہوریت کی جگہ کسی استبداد کو اپنے ملک پر مسلط کرنے کی سازش میں آلۂ کار بنیں اور نہ آئین وقانون کے خلاف کوئی اُن کو استعمال کر سکے۔ انہیں ایمانداری کے ساتھ جمہوریت کے اس نظریے کا قائل ہونا چاہیے اور اس پر سختی کے ساتھ کاربند رہنا چاہیے کہ "حکمرانی دراصل قوم کے نمائندوں کا کام ہے جنہیں قوم اپنی آزاد مرضی سے اپنا نمائندہ بناتے اور ملازمین حکومت کا کام یہ ہے کہ قوم جن لوگوں کو بھی اپنا نمائندہ منتخب کرے، وہ ان کے ماتحت کام کریں"۔ ان کے ضمیر میں اتنی طاقت ہونی چاہیے کہ وہ قوم سے انتخاب کی آزادی سلب کرنے کے لیے نہ خود آمادہ ہوں اور نہ کوئی ان سے یہ خدمت لے سکے۔

۳- قوم کے بااثر لوگوں میں اکثریت ایسے افراد کی ہونی چاہیے جو خود غرضی میں اتنے اندھے نہ ہو جائیں کہ اپنے اقتدار کا تخت بچھانے کے لیے خود اپنی قوم کو اور اپنے ملک کے ملازمین حکومت کو ضمیر فروشی، بزدلی اور بددیانتی کی تربیت دینے پر تُل جائیں۔ ان میں اگر اقتدار کی طلب ہو بھی تو بدرجۂ آخر وہ حدود آشنا ہونی چاہیے۔ وہ اقتدار کو خریدنے یا زبردستی کھسوٹ لینے کے بجائے خدمت اور حسنِ عمل کے ذریعہ سے قوم میں اپنا اعتماد پیدا کریں اور پھر عوام کی مرضی (یعنی آزاد مرضی) سے، اگر وہ ان کو حاصل ہو جائے، تو برسرِ اقتدار آئیں۔

یہ تین شرطیں جہاں نہ پائی جاتی ہوں وہاں درحقیقت کوئی جمہوریت نہ قائم ہو سکتی ہے، نہ چل سکتی ہے۔ آزادی اور جمہوریت کا بوجھ مضبوط ستون اور شہتیر ہی سنبھال سکتے ہیں۔ بودے اور گھن کھاتے ہوئے ستونوں اور شہتیروں پر یہ بوجھ جہاں بھی لادا جائے گا، زمین بوس ہو جائے گا۔ نام جمہوریت کا ہو گا مگر استبداد کارفرما ہو گا۔ ناجائز ذرائع سے برسرِ اقتدار آنے والے لوگ کبھی نیک نیت نہیں ہو سکتے۔ وہ قانون سازی اور کارفرمائی، دونوں میں حق وانصاف کے بجائے اپنی اغراض کو بالاتر رکھیں گے۔ ایسی صورت میں سرے سے نہ تو قانون کا احترام باقی رہ سکتا ہے

اور نہ حکومت کی طاقت بگاڑ کے بجائے اصلاح کی خدمت انجام دے سکتی ہے۔

سب سے بڑی مصیبت ہمارے لیے یہ ہے کہ ہمارے اخلاق کی تعمیر جن بنیادوں پر ہوئی تھی وہی سرے سے منہدم ہوتی چلی جارہی ہیں۔ خدا اور رسول اور قرآن اور آخرت پر ایمان وہ اولین چیز ہے جس پر ایک مسلمان فرد اور قوم کے اخلاق کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ مگر ہمارا نظامِ تعلیم، طرزِ تعلیم اور تعلیمی ماحول اس بنیاد کو مضبوط کرنا تو درکنار، اسے قائم رکھنا بھی درکنار، روز بروز اسے کمزور سے کمزور تر کرتا چلا جارہا ہے اور اس کے برعکس ایک لادینی تہذیب کے تصورات، اقدار اور طور طریقوں کی برتری کا نقش دلوں پر بٹھا رہا ہے۔ کسی کو محسوس نہیں ہوتا کہ یہ حرکت کر کے ہم دراصل خود اپنی قومی خودی کی بیخ کنی کر رہے ہیں۔ پھر دوسری چیز حرام و حلال کی وہ تمیز تھی جس کے بقا و استحکام پر ہمارے اخلاق کے بقا و استحکام کا انحصار تھا۔ مگر ہم اسے بچانے اور سنبھالنے کے بجائے اس کی جڑ کاٹنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ہمارا پورا معاشی نظام سُود پر چل رہا ہے جیسے ہر مسلمان جانتا ہے کہ اسلام نے اس کو حرام کیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں شراب نوشی روز بروز بڑھتی جارہی ہے، حالانکہ دنیا کی قوموں میں مسلمانوں کا یہ امتیازی وصف تھا کہ ان کے معاشرے نے شراب کا سدِباب کرنے میں سب سے بڑھ کر کامیابی حاصل کی ہے۔ ہمارے ہاں جنسی بداخلاقی بھی روز افزوں ہے اور ہم مغرب کی تقلید میں عُریانی، بے حیائی، اختلاطِ مرد و زن، فحش لٹریچر، فحش فلموں اور فحش گانوں کے ذریعہ سے اس کو فروغ دیتے چلے جارہے ہیں، حالانکہ مسلم معاشرہ کبھی اس لحاظ سے بھی دنیا کے تمام معاشروں سے بلند اخلاق کا حامل تھا۔ ان شدید ترین حرمتوں کو توڑ دینے کے بعد اس کا آخر کیا امکان ہے کہ ہمارے عوام اور خواص میں سرے سے کوئی تمیزِ حرام و حلال باقی رہ جائے اور وہ رشوت، خیانت، غبن، غصب، چوری اور ایسے ہی دوسرے حرام افعال سے اجتناب کریں۔ تیسری اہم چیز وہ قدریں ہیں جو ہم کو اخلاق کی بلندی پر قائم رہنے کے لیے اپنے دین سے اور اپنی ملّی روایات سے ملی تھیں۔ حق پسندی و حق شناسی، عدل و انصاف، دیانت و امانت، راستبازی، قناعت، حیا، عفت، مروّت، اور سب سے بڑھ کر تقویٰ اور احسان وہ چیزیں تھیں جو مسلمان

ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے اصل میں قابلِ قدر ہونی چاہیے تھیں۔ مگر ہم نے ان کی جگہ خوشحالی، شاندار زندگی، چودھراہٹ، غلبہ و اقتدار، اور عیش کو قابلِ قدر ٹھیرا لیا ہے، قطعِ نظر اس سے کہ وہ کسی ذریعہ سے میسّر ہو۔

اب آپ پوچھیں گے کہ اخلاقی پستی کے اس گڑھے میں گرنے سے اور اس کے تباہ کُن نتائج سے ہم کیسے بچ سکتے ہیں؟ میں عرض کروں گا کہ یہ سوال آپ خلا میں نہیں کر رہے ہیں بلکہ ایک خاص ملک اور خاص قوم میں کر رہے ہیں جس کا ایک خاص مزاج صدیوں کی روایات سے بنا ہوا ہے، اور ایسی حالت میں کر رہے ہیں کہ ایک مدتِ دراز سے آپ کے لیے مادّی ترقی اور معیارِ زندگی کی بلندی کا سوال سب سے زیادہ اہم اور اخلاق کا سوال سب سے زیادہ غیر اہم بنا رہا ہے، حتیٰ کہ تعمیرِ اخلاق کے لیے اجتماعی کوشش کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی ہے۔

اِس حالت میں سب سے پہلے تو اِس ضرورت کا احساس پیدا ہونا چاہیے، اور یہ احساس عوام سے بڑھ کر خواص اور ملک کے کارفرماؤں میں ہونا چاہیے۔ جب تک وہ یہ نہ جانیں گے کہ اخلاق کے بغیر ہمارے لیے کسی ترقی کا، بلکہ ایک آزاد قوم کی حیثیت سے بقا کا بھی امکان نہیں ہے، اُس وقت تک قومی پیمانے پر تعمیرِ اخلاق کے لیے کچھ نہ کیا جا سکے گا۔ انفرادی کوششیں تو خدا کے فضل سے ہوتی رہی ہیں۔ ہمارا معاشرہ ایسے افراد سے کبھی خالی نہیں رہا ہے جنہوں نے اپنی حد تک اس کی سعی کی ہو۔ مگر ان کا کوئی نتیجہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا تھا کہ زوال کی رفتار اتنی تیز نہ ہو سکی جتنی اس کے بغیر ہوتی۔ قوم کا اخلاق بنانا بہرحال قومی پیمانے پر کوشش چاہتا ہے، اور وہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتی کہ ملک کے کارفرماؤں کو اس کی ضرورت کا، اور اس کے نہ ہونے کے تباہ کن نتائج کا احساس ہو۔

احساسِ ضرورت کے بعد یہ جاننا اور سمجھنا بھی ناگزیر ہے کہ تعمیرِ اخلاق کسی بنیادی فلسفے اور کسی نقشۂ تعمیر کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ آپ صرف اخلاق، اخلاق کی رٹ لگا کر، اور محض سطحی طور پر چند معروف اخلاقیات کا اشتہار دے کر تو کوئی قومی اخلاق نہیں بنا سکتے۔ آپ کو لامحالہ ایک اساسی

فلسفہ درکار ہے جس کے لحاظ سے آپ خیر و شر کا امتیاز اور اخلاقی اقدار کا تعین کریں۔ آپ کو ان اخلاقی اقدار کی پشتیبانی کے لیے کچھ عقائد درکار ہیں جو نفوس کے اندر ان کا احترام گہری جڑوں کے ساتھ جما دیں۔ آپ کے سامنے تعمیرِ اخلاق کے لیے کوئی نقشہ بھی ہونا چاہیے جس کے مطابق آپ سیرت و کردار کی بنیادیں اٹھائیں۔ انسان بنانے سے پہلے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کیسے انسان بنانا چاہتے ہیں، اور یہ بھی جاننا چاہیے کہ اس خاص قسم کے انسان کس طرح بن سکتے ہیں۔

تیسری بات یہ بھی سمجھ لینی چاہیے کہ آپ کسی قوم میں باہر سے کوئی فلسفہ اور نقشہ لاکر تعمیرِ اخلاق نہیں کر سکتے۔ تعمیر اگر ممکن ہے تو اُسی فلسفے اور نقشے پر ممکن ہے جو اس خاص قوم کے مزاج اور اس کی روایات میں پہلے سے اپنی گہری جڑیں رکھتا ہو۔ خصوصیت کے ساتھ یہ بات مسلمانوں کے معاملہ میں بہت اہم ہے۔ یہ کوئی وحشی یا نو دولتی قوم نہیں ہے جس کا کوئی ماضی نہ ہو، جس کا اپنا کوئی نظریۂ حیات اور فلسفۂ اخلاق نہ ہو، جو اب نئے سرے سے قومی زندگی کا آغاز کر رہی ہو۔ ایسی قوم میں تو کوئی فلسفہ کہیں سے درآمد کر کے لایا بھی جا سکتا ہے۔ لیکن مسلمان صدہا برس سے اپنے کچھ عقائد رکھتے ہیں۔ کوئی معیارِ خیر و شر رکھتے ہیں۔ کچھ اخلاقی اقدار رکھتے ہیں۔ اور اپنے اس سرمایے پر آج اس گئی گزری حالت میں بھی اُن کو فخر ہے۔ ان کی تاریخ نے ان کو انسانیت کے کچھ نمونے دیئے ہیں جنہیں وہ سیرت و کردار کی بلند ترین مثالیں سمجھتے ہیں اور وہی ان کی نگاہ میں معیارِ کمال ہیں۔ آپ کوئی بیرونی فلسفہ کچھ نئی اقدار اور کچھ نئے معیاروں کے ساتھ لاکر یہاں تعمیرِ اخلاق کرنا چاہیں گے تو آپ کو ایک مدتِ دراز تک اپنی ساری قوتیں ان پُرانی بنیادوں کو منہدم کرنے اور نئی بنیادیں رکھنے میں صرف کرنی پڑیں گی۔ یہ کوشش اس قوم کے رہے سہے اخلاق کا بھی ستیاناس کر دے گی۔ اِس تخریب سے اگر یہ کسی نہ کسی طرح جی بچی تو نئے اخلاق کی تعمیر کر لیجیے گا۔ ایک صدی کے بعد شاید اس تعمیر کے نتائج سامنے آنے شروع ہو سکیں۔ لیکن اگر اسلام اور اس کی روایات کی بنیاد پر آپ تعمیرِ اخلاق کرنا چاہیں تو کل ہی سے یہ کام

شروع ہو سکتا ہے ، اور ہر نیا آنے والا دن اس کے اثرات و نتائج سامنے لا سکتا ہے ، بشرطیکہ آپ تعمیر کے ساتھ ساتھ تخریب کا کام جان بوجھ کر نہ کرتے رہیں۔

اسلام کی بنیادوں پر تعمیرِ اخلاق کے تصور کو کسی محدود معنی میں نہ لیجیے ۔ اس کے لیے آپ کو اپنا پورا انتظامِ تعلیم اپنے نصاب اور طریقوں اور ماحول سمیت بدلنا ہو گا ۔ اس کے لیے افکار بنانے والے تمام ذرائع ریڈیو ، سینما ، ٹیلیویژن ، صحافت ، لٹریچر وغیرہ ، صحیح و مناسب طریقے سے استعمال کرنے ہوں گے ، اور ان کے غلط استعمال کو روکنا ہو گا ۔ اس کے لیے منتظمینِ حکومت تیار کرنے والے اور دفاعی خدمات کی تربیت دینے والے اداروں کے طرزِ تربیت میں بھی تبدیلی کرنی ہو گی ۔ اس کے لیے قوانین کی اصلاح بھی کرنی ہو گی اور پوری انتظامی پالیسی میں بھی تغیر کرنا ہو گا ۔ اور سب سے بڑھ کر ، اس کے لیے ہمارے کارفرماؤں کو اپنی نیتوں اور ارادوں اور طور طریقوں کو بدلنا ہو گا اور انتخابات جیتنے ، اقتدار حاصل کرنے اور اقتدار پر قابض رہنے کے ذرائع و وسائل کی اصلاح بھی کرنی ہو گی ۔ یہ درحقیقت کوئی آسان کام نہیں ہے ۔ بڑا دشوار کام ہے جس پر طبیعتیں بمشکل اُس وقت ہی آمادہ ہو سکتی ہیں جب عام و خاص ، سب کو یہ محسوس ہو جائے کہ قوم اگر ڈوبی تو یہاں کوئی تیرنے والا نہ رہ سکے گا ۔

---

## ضروری اعلان

منصبِ رسالت نمبر کی چند کاپیاں دفتر ترجمان القرآن میں برائے فروخت موجود ہیں ۔ قیمت فی کاپی ۳/۵۰ روپے ہے ۔ مگر اب فی کاپی ۲ روپے مع ڈاک خرچ کے جو اصحاب چاہیں دفتر سے منگوا سکتے ہیں ۔

مینیجر ترجمان القرآن

اچھرہ ، لاہور